فتویٰ اور دیگر غیر قانونی رسوم کے درمیان فرق

مولانا سید باچا آغا

ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام خدا کا آخری اور مکمل ترین دین ہے، جس کی تکمیل کا اعلان قرآن مقدس میں موجود ہے، یہ روئے زمین پر آیا ہی اس لئے ہے کہ پوری کائنات کو اس خدائی نظام پر چلائے اور ان گوشوں کو اجاگر کرے جو انسانوں کو فضل وکمال، شرف ومکرمت، یکجہتی ویگانگت اور اخوت ومحبت کی لازوال دولت سے مالا مال کردے اور اس کے ساتھ ہی انسان، انسانیت اور اس کے تقاضوں سے ایک لمحہ کے لئے الگ تھلگ نہ ہونے پائے، جو اس کا سب سے نمایاں طرہ امتیاز ہے۔

رب العالمین نے اس عظیم الشان ''نظام حیات'' کی بقاء کے لئے قرآن مقدس جیسی کتاب نازل کی اور قیامت تک کے لئے اس کی حفاظت کا اعلان کیا، پھر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک پاک باز وبرگزیدہ رسول اور معصوم معلم کائنات بنا کر مبعوث فرمایا اور ختم نبوت کے تاج سے سرفراز کیا، تاکہ پورے اطمینان کے ساتھ آپ کی تعلیم وتبیین، تزکیہ وتطہیر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ نشان راہ پر ایمان لایا جائے اور اپنی زندگی کا محور ومرکز بنالیا جائے اور اس طرح انسان اس منزل مقصود تک پہنچ جائے جو اس کی تخلیق کا منشاء ہے، عہد صحابہ تک یہ نظام، فکر ونظر سے بڑھ کر عمل اور ہر حرکت وسکون میں جاری وساری تھا، آفتاب نبوت گور پوش ہو چکا تھا، مگر اس کی گرمی سے سینے اسی طرح معمور تھے، شعبہ جات ایمان کی شاخوں میں کسی شاخ کی پژمردگی ایک لمحہ کے لئے بھی انہیں برداشت نہیں تھی، صحابہ کرامؓ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال واقوال کے چلتے پھرتے مجسمے تھے، ان کی کوئی ادا اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہ تھی اور سچ پوچھئے تو کتاب وسنت کی یہ ایسی دل افروز شمعیں تھیں، جن سے پوری آبادی بقعہ نور بنی ہوئی تھی، مگر جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا، اس کی ضرورتیں بڑھتی اور پھیلتی گئیں، پھر اسلامی حکومتوں کی بڑھتی ہوئی حدود نے نئے نئے مسائل سامنے لاکھڑے کئے، ادھر مزاجوں میں بڑی تیزی سے انقلاب آچکا تھا جو رات دن پھیلتا جارہا تھا، سوز وگداز اور سادہ دلی وسادہ زندگی جو صحابہ کرامؓ

کا شیوہ خاص تھا، ختم ہوتا جارہا تھا، اس لئے حالات کا تقاضا ہوا کہ کتاب وسنت کی تعلیمات ایک نئے انداز سے مرتب ہوں، صحابہ کرامؓ کے اقوال تلاش کئے جائیں اور دین کا سارا ذخیرہ سامنے رکھ کر ''نظام حیات'' کی ترتیب ایسے جاذب نظر اور دلکش انداز میں ہو کہ جسے عالم وجاہل، ذہین وغبی، عربی وعجمی اور شہری وبدوی ہر ایک بآسانی سمجھ لیں اور جو مسائل صراحتاً کتاب وسنت اور اقوال صحابہ میں موجود نہیں ہیں، علماء کے باہمی غور وفکر اور بحث وتمحیص سے مستنبط ہوں، تاکہ آنے والی نسلیں پریشانیوں سے دوچار نہ ہونے پائیں اور کتاب وسنت کی روشنی میں تیز گامی سے چل سکیں اور ساتھ ہی ان کی عجلت پسند اور سہل طلب طبیعتیں تلاش وتجسس کی مشقت سے محفوظ رہ جائیں، چنانچہ علمائے ربانیین نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اس کے لئے باضابطہ سب سے پہلے سراج الامت حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ آمادہ ہوئے اور آپ نے اپنے عہد کے علمائے کرام کی ایک ایسی معقول تعداد جمع کی، جس میں ہر علم وفن کے ماہرین شریک تھے، جو اپنے علم وفن میں بصیرت ومہارت کے ساتھ ساتھ زہد وتقویٰ، خدا ترسی وفرض شناسی اور دوسرے اوصاف سے بھی متصف تھے، جن علماء کرام کی مجلس میں استنباط واستخراج مسائل کا یہ مہتم بالشان کام انجام پایا، ان کی تعداد سینکڑوں سے بڑھ کر ہزار تک تھی، ان میں چالیس علماء خصوصی صلاحیتوں کے مالک تھے اور مختلف علم وفن کے ماہرین شمار کئے جاتے تھے۔(۱)

فقہ اور دین کے وہ پیش آمدہ مسائل جو دریافت کرنے والوں اور سائلین کے جواب میں بتائے گئے یا اس سادہ انداز پر مرتب ہوئے، وہ ''فتاویٰ'' کے قالب میں جلوہ گر ہوئے اور اس سلسلے نے انسانی ضرورتوں کا پورا پورا ساتھ دیا، کتاب وسنت اور فقہ سے مستنبط اس مفید وجدید شکل نے عام مسلمانوں کو تحقیق وجستجو کی ایک صبر آزما مصیبت سے بچالیا، فتاویٰ کا یہ پھیلاؤ انسانی ضرورتوں اور سوالات کے ساتھ بڑھتا گیا، انسانی زندگی کے مختلف شعبہ جات سے متعلق مسائل جیسے جیسے پیدا ہوتے گئے، کتاب وسنت اور فقہ سے مستنبط مسائل کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا گیا، کسی مرحلے پر جمود پیدا نہیں ہوا، چنانچہ آج انسانی زندگی سے متعلق کوئی ایسا سوال نہیں ہے، جس کا جواب مفتی آپ کو فراہم کرکے نہ دے سکے، مفتیان کرام کی جماعت جن کو فقہ سے مناسبت تامہ ہوتی ہے، ہر زمانہ میں پائی گئی اور عوام وخاص ہر ایک کا اس جماعت کی طرف رجوع عام رہا اور یہ اپنے علمی رسوخ، خداداد صلاحیت اور مخصوص فہم کی وجہ سے اس کام میں ممتاز اور نمایاں رہی اور اسے رات دن اسی کام کے ساتھ اشتغال رہا۔

فتویٰ کا معنی ومفہوم:.....لغت میں فتویٰ دو طرح پڑھا جاتا ہے:(۱)الفَتوىٰ ، بفتح الفا (۲) الفُتوى، بضم الفاء، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ''الفتوىٰ بفتح الفاء ، وقيل بضم الفاء ايضاً، كما في تاج العروس ولكن الأول أصح وأشهر''.(۲)

یعنی''الفتوىٰ، فا کے فتحہ کے ساتھ اور بعضوں نے کہا ہے کہ الفتوىٰ ، فا کے ضمہ کے ساتھ، جس طرح کہ تاج

العروس میں بھی ہے، لیکن پہلا قول صحیح اور مشہور ہے"۔

اسی طرح فتیاء بضم الفاء بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے:

"الفتوىٰ والفتيا إسمان يوضعان من موضع الإفتاء إلا أن لفظ الفتيا أكثر استعمالاً في كلام العرب من لفظ الفتوى۔"(۳)

یعنی "فتویٰ اور فتیا دو اسم ہیں جو افتاء کی جگہ استعمال ہوتے ہیں مگر یہ کہ لفظ فتیا عربی زبان میں فتویٰ کے بنسبت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔"

لغت میں اس کا معنی یہ ہے کہ "سوال کا جواب دینا" چاہے وہ سوال احکام شرعیہ سے متعلق ہو یا اس کے علاوہ ہو، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے ﴿یا ایها الملأ افتونی فی رؤیای ان کنتم للرؤیا تعبرون﴾(۴)

یعنی "اے سردار! اگر تم خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہو تو مجھے میرے خواب کی تعبیر بتاؤ۔"

اس آیت میں دنیاوی امر کے بارے میں سوال لفظ فتویٰ سے کیا گیا ہے، بعد میں لفظ فتویٰ کو کسی شرعی سوال کے جواب دینے کے لئے خاص کیا گیا، قرآن کریم میں اس معنی کے لحاظ سے ارشاد خداوندی ہے ﴿ویستفتونك فی النساء قل الله یفتیکم فیهن﴾(۵)

یعنی "(اے پیغمبر!) لوگ تم سے (یتیم) عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں، کہہ دو کہ اللہ تم کو ان کے (ساتھ نکاح کرنے کے) معاملے میں اجازت دیتا ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿یستفتونك قل الله یفتیکم فی الکلالة﴾(۶)

یعنی "حکم پوچھتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے، سو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے (حکم بتاتا ہے) تم کو کلالہ کا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد ارشادات میں فتویٰ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے، جیسا کہ ارشاد گرامی ہے:

"اجرو کم علی الفتیا اجرو کم علی النار۔"(۷)

"تم میں سے فتویٰ دینے پر زیادہ جرات مند وہ ہوگا، جو تم میں سے جہنم کی آگ پر جرات مند ہو۔"

بہر حال، دور حاضر میں فتویٰ سے مراد کسی دینی مسئلہ کا جواب دینا ہے، یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ہم نے لفظ "شرعی" کے بجائے لفظ "دینی" کو اپنایا جس کی وجہ یہ ہے کہ مفتی صرف احکام شرعیہ عملیہ کا جواب نہیں دیتا بلکہ بعض اوقات مسائل دینیہ اعتقادیہ، احادیث کے معانی اور اس کی کیفیتِ اسناد وغیرہ کا بھی جواب دیتا ہے، جن کا تعلق علوم دینیہ سے ہوتا ہے، علماء محققین نے افتاء کی جتنی تعریفیں کی ہیں، ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بتادینا۔"(۸)

افتاء وقضاء میں فرق:..... افتاء اور قضاء قریب قریب دونوں ایک ہی ہیں، بیشتر شرائط اور اصول میں دونوں برابر ہیں،

اس لئے فقہائے کرام نے جہاں قاضی یا قضاء کے شرائط بیان کئے ہیں تو وہاں آخر میں یہ بات وضاحت کے ساتھ کہی ہے کہ یہ جملہ شرائط مفتی کے لئے بھی ہیں اور جہاں مفتی کی شرائط کا ذکر ہیں، وہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ قاضی ان شرائط میں مفتی کی مانند ہیں، البتہ قاضی اور مفتی میں چند وجوہ کی بناء پر فرق ضرور پایا جاتا ہے، جو حسب ذیل ہیں:

اول:.....فتویٰ صرف امر شرعی کو بیان کرنے کا نام ہے، جیسے کسی چیز کا جواز، ندب یا وجوب یا کراہت یا حرمت وغیرہ اور فتویٰ میں مستفتی پر فتویٰ کے مقتضی پر عمل کرنے کے بارے میں کوئی الزام یا اجبار نہیں ہے، جبکہ قضاء میں محکوم علیہ پر قاضی سے صادر ہونے والے حکم پر عمل کرنے میں الزام واجبار ہے۔

دوم:.....فتویٰ کا دارومدار اس سوال پر ہے جو سائل نے مفتی سے کیا ہے، پس مفتی اس کا حکم یہ فرض کر کے بیان کرتا ہے کہ یہ سوال واقع اور نفس الامر کے مطابق ہے، نفس الامر میں اس کی صحت کی تحقیق کرنا مفتی کی ذمہ داری نہیں، اسی وجہ سے مفتی، فتویٰ کے شروع میں لکھتا ہے کہ ''پوچھے گئے مسئلے کا حکم یہ ہے کہ'' اس سے پوچھے گئے سوال کا واقع اور نفس الامر کے مطابق ہونا لازم بھی نہیں آتا۔

سوم:.....فتویٰ ان اشیاء میں چلتا ہے جن پر وجوب، حرمت، اباحت، ندب، کراہت، صحت یا بطلان وغیرہ کا ترتب ہوسکتا ہو جبکہ قضاء ان اشیاء میں نہیں چلتا، جن پر وجوب، ندب، اباحت وغیرہ کا ترتب ہوتا ہو، اس لئے کہ ندب اور کراہت کسی فعل کے کرنے یا نہ کرنے پر بدون کسی الزام واجبار کے ابھارنے کا نام ہے جبکہ قضاء محض اجبار والزام ہے۔

منصب افتاء کی عظمت:.....فتویٰ یا افتاء ایک عظیم اور مہتم بالشان امر ہے اور اس کی عظمت واہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فتویٰ کی نسبت اپنی طرف کی ہے، ارشاد خداوندی ہے ﴿یستفتونك قل الله یفتیکم فی الکلالة﴾ (۱۰)

فتویٰ کی عظمت شان کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فتویٰ اور اسلامی مسئلے کے جواب کی نسبت اپنی ذات اقدس کی طرف فرمائی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر اس عظیم اور پروقار عہدہ کو سنبھالے رکھا اور بے شمار فتوے جاری کئے، اگرچہ اس وقت فتویٰ یا مفتی کی اصطلاح رائج نہ تھی، لیکن پہلے بتا چکے ہیں کہ فتویٰ کا اصل معنی کسی شرعی مسئلے کا جواب دینا ہے، اس اعتبار سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسائل کے جوابات فتاویٰ ہی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے کے مجیب اور مفتی اعظم بھی تھے، چونکہ لفظ رسول مفتی سے بدرجہا بہتر وافضل ہے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ''رسول'' کے مقدس نام سے یاد کئے جاتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ منصب صحابہ کرامؓ کے سپرد ہوا، مگر زیادہ نازک اور پرخطر ہونے کی وجہ سے اکثر صحابہ کرامؓ یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ یہ کام کسی اور صاحب کے سپرد کردیا جائے اور خود اس ذمہ داری سے بچ جائیں، اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ میں فتویٰ دینے

والوں کی تعداد کم رہی، علامہ ابن قیمؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''اعلام الموقعین'' میں صحابہ کرامؓ میں سے مفتی حضرات کی تعداد ایک سو تیس سے کچھ اوپر بتائی ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں زیادہ فتویٰ دینے والے کل سات حضرات تھے، فرماتے ہیں:

''فكان المكثرون منهم سبعًا :عمر بن الخطاب وعلي بن أبي طالب و عبدالله بن مسعود وعائشة أم المؤمنين وزيد بن ثابت و عبدالله بن عباس و عبدالله بن عمر رضى الله عنهم اجمعين۔''(۱۱)

یعنی ''ان میں زیادہ فتویٰ دینے والے کل سات حضرات تھے، حضرت عمر ابن خطاب، حضرت علی ابن ابی طالب، حضرت عبداللہ ابن مسعود، ام المومنین حضرت عائشہ، حضرت زید ابن ثابت، حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین''۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فتویٰ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اتنی احتیاط کی کہ صرف اپنے ہی فتویٰ اور تحقیق کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اپنے دارالتحقیق والافتاء میں مسائل کی تحقیق وجستجو کے لئے اس وقت مجتہدین اور جید علمائے کرام کی شوریٰ بنائی، یہ شوریٰ حالات کے اعتبار سے کم وبیش ہوتی رہتی تھی، لیکن مؤرخین علمائے کرام نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے دارالتحقیق والافتاء کے محققین اور مشاورین کی تعداد چالیس تھی۔(۱۲)

حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ منصب افتاء کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''افتاء کا منصب علمی سلسلوں میں سب سے زیادہ مشکل، دقیق اور اہم ترین سمجھا گیا ہے، فقہ کی لاکھوں متماثل جزئیات اور ان کے متعلقہ احکام میں تھوڑے تھوڑے فرق سے حکم کا تفاوت محسوس کرنا عمیق علم کو چاہتا ہے، جو ہر عالم بلکہ ہر مدرس کے بھی بس کی بات نہیں، جب تک فقہ سے کامل مناسبت، ذہن وذکاء میں خاص قسم کی صلاحیت اور قلب میں مادہ تفقہ نہ ہو، اس لئے مدارس دینیہ میں افتاء کے لئے شخصیت کا انتخاب نہایت پیچیدہ مسئلہ سمجھا گیا ہے، جو کافی غور وفکر اور سوچ وبچار کے بعد ہی حل ہوتا ہے اور پھر بھی تجربات کا محتاج رہتا ہے۔''(۱۳)

جن لوگوں نے اپنی کم علمی اور وسعتِ مطالعہ کی کمی کی وجہ سے علماء دین پر جمود اور تنگ نظری کا الزام لگایا ہے، وہ بڑی حد تک معذور ہیں، البتہ قابل صد ملامت وہ حاسدین ہیں، جو از راہِ کینہ پروری ایسی باتیں کہتے ہیں۔ ہر دور کے فتاویٰ کی کتابیں مختلف زبانوں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں، ان میں ہر دور کے نئے مسائل بھی درج ہیں اور ان کے جوابات بھی، ان کتابوں سے بڑھ کر ثبوت میں اور کیا کہا جاسکتا ہے۔(۱۴)

منصب افتاء اور خطرات:.....منصب افتاء اگرچہ ایک عظیم مقام ہے، لیکن اس عظمت کے ساتھ ساتھ اس میں عظیم

خطرات بھی موجود ہیں، کیونکہ بلند مقام پر چڑھنے والا جب گرتا ہے تو بلند مقام ہی سے گرتا ہے، تو منصب افتاء کی عظمت کے پیش نظر اس میں لاپرواہی سے فتویٰ دینا یا غفلت کرنا باعث عذاب ہوتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''من افتیٰ بغیر علم کان إثمه علیٰ من أفتاه۔''(۱۵)

یعنی ''جس نے بغیر علم کے فتویٰ دیا تو اس کا گناہ اسی (فتویٰ دینے والے) پر ہوگا۔''

اسی طرح یہ بھی ارشاد فرمایا: '' اجرو کم علی الفتیا اجرو کم علی النار۔''(۱۶) ''تم میں سے فتویٰ دینے پر زیادہ جری وہ ہوگا، جو تم میں سے جہنم کی آگ پر جری ہو۔''

لہٰذا مفتی کا فریضہ ہے کہ اگر وہ اس منصب کے لائق نہیں ہے تو پھر ہرگز افتاء کی جرات نہ کرے، ورنہ وہ گناہ گار ہوگا اور سخت مجرم اور جس صاحب اقتدار نے اسے اس منصب پر فائز کیا ہے، وہ بھی گناہ گار ہوگا۔

اس سلسلے میں علامہ ابن القیم نے لکھا ہے:

''من أفتی الناس ولیس بأهل الفتویٰ فهو آثم، عاص و من أقرّه من ولاة الأمور علیٰ ذالك فهو آثم ایضاً۔''(۱۷)

''جو نااہل ہونے کے باوجود لوگوں کو فتویٰ دینے لگے، وہ گناہ گار اور نافرمان ہے اور ذمہ داروں میں سے جو ایسے شخص کو اس عہدہ پر رہنے دے، وہ بھی گناہ گار ہے۔''

پنچائیت، جرگہ کی حیثیت:..... فتویٰ کے حوالے سے مذکورہ بالا بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلام نے ہمیں جو ''نظامِ حیات اور قانون'' فراہم کیا ہے، وہ ہر طرح کی پیچیدگیوں سے پاک ہے اور اس میں لاقانونیت کا شائبہ تک نہیں، دور حاضر کے تناظر میں جب ہم اپنے ملکی قوانین پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، سالہا سال تک مقدمات وغیرہ کے فیصلے تعطل کا شکار رہتے ہیں، جن سے تنگ آکر سائل یا تو قانون شکنی کا ارتکاب کر لیتا ہے یا تو پھر ہر ایک اپنے رسم ورواج کے مطابق از خود ہی اپنے مقدمات کا فیصلہ کرنے لگتا ہے، اس طرح مقامی رسم ورواج غالب آجاتے ہیں، یہی رسم ورواج پنچائیت یا جرگہ وغیرہ کی شکل میں بااثر حلقوں کے توسط سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ اسلام میں پنچائیت یا جرگہ وغیرہ کا کوئی تصور نہیں، البتہ جن علاقوں میں مسلم جج موجود نہ ہوں یا مسلمان حاکم کی عدالت میں مقدمہ لے جانے کا قانوناً اختیار نہ ہو، یا مسلمان حاکم قواعد شرعیہ کے مطابق فیصلہ نہ کرتا ہو تو اس طرح کی ضرورت شدیدہ میں مذہب حنفی کے مطابق مسلمانوں کی جماعت کا حکم بھی قضائے قاضی کے قائم مقام ہو جائے گا (جو کہ اصل میں امام مالکؒ کا مذہب ہے) اس کی صورت یہ ہے کہ محلّہ یا بستی کے بااثر اور دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت (جن کی تعداد کم از کم تین ہو) کے سامنے اپنا معاملہ پیش کیا جائے اور وہ جماعت واقعہ کی تحقیق کر کے شریعت کے موافق فیصلہ کر دے، اس جماعت مسلمین کو اگر پنچائیت یا جرگہ وغیرہ کا نام دیا جائے تو کوئی حرج نہیں، جبکہ حقیقت یہ

ہے کہ موجودہ زمانے میں جو پنچائیت وغیرہ ہیں، تو ان کے بارے میں وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں دیندار شخص شاید نہ ہو اور یہ پنچائیت جماعت مسلمین کے شرائط پر پورا بھی نہیں اترتی، علماء نے جماعت مسلمین کے لئے جو شرائط مقرر کئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

جماعت مسلمین یا پنچائیت کے شرائط

(۱).....کم از کم تین آدمیوں کی جماعت ہو، ایک یا دو آدمی فیصلہ کریں تو وہ معتبر نہیں۔

(۲).....اس جماعت کے سب ارکان کا عادل ہونا شرط ہے اور عادل وہ شخص ہے جو تمام کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو اور صغائر پر مصر نہ ہو اور اگر کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہو تو فوراً توبہ کر لیتا ہو، لہٰذا سود خور اور رشوت لینے والا، داڑھی منڈوانے والا، جھوٹ بولنے والا اور بے نمازی اس جماعت کا رکن نہیں بن سکتا۔ (اگر بدقسمتی سے کسی جگہ کے بااثر لوگ دیندار نہ ہوں تو یہ تدبیر کر لی جائے کہ وہ بااثر اشخاص چند داروں کو اختیار دے دیں، تاکہ شرعاً فیصلہ کی نسبت دیندار جماعت کی طرف ہو اور ان بااثر اشخاص کو کوشش کا ثواب حاصل ہو جائے)۔

(۳).....فیصلہ میں علماء کی شرکت لازم اور شرط ہے، صرف عوام کی جماعت کا فیصلہ حکم قاضی کے قائم مقام نہیں ہو سکتا، اس لئے اولاً تو یہ چاہئے کہ جماعت کے سب ارکان اہل علم ہوں اور اگر یہ میسر نہ ہو تو کم از کم ایک معاملہ فہم عالم کو ضرور جماعت کا رکن بنائیں اور دوسرے تمام ارکان معاملے کے تمام پہلوؤں کو ان عالم سے خوب سمجھ کر رائے قائم کریں اور اگر کسی جگہ یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر یہ لازم ہے کہ جماعت کے ارکان معاملہ کی روداد مکمل کر کے علماء محققین سے ہر ہر جز کا حکم دریافت کریں، ان کا جو فتویٰ ہو، اس کے موافق فیصلہ کیا جائے، اگر ایسا نہ کیا، بلکہ عوام نے محض اپنی رائے سے فیصلہ کر دیا تو وہ حکم نافذ نہ ہوگا اور فیصلہ بالکل بیکار و غیر معتبر رہے گا، اگرچہ وہ فیصلہ شریعت کے موافق بھی ہو۔

(۴).....جماعت مسلمین کے سب ارکان متفقہ فیصلہ دیں، اگر رائے مختلف رہے اور کثرتِ رائے کی بناء پر فیصلہ کرنا چاہیں تو وہ فیصلہ معتبر نہ ہوگا، پس اگر ارکان میں اختلاف رہے تو مقدمہ خارج کر دیا جائے۔ (۱۸)

مذکورہ بالا شرائط کو اگر مدنظر رکھا جائے تو موجودہ دور کا پنچائیت تو بالکل اس کے برعکس ہے، دور حاضر کے پنچائیت میں علماء کی جانب سے مقرر کردہ کوئی ایک شرط بھی نہیں پائی جاتی، کوئی بااثر شخص یا محلہ و بستی کا کوئی وڈیرہ، سردار وغیرہ جو چاہے، جیسے چاہے، فیصلہ کا اختیار رکھتا ہے اور کوئی اس کے حکم کی خلاف ورزی بھی نہیں کر سکتا، بلکہ خلاف ورزی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا، دور حاضر میں پنچائیت کے فیصلے زیادہ تر قتل یا کاروکاری جیسے واقعات میں سامنے آتے ہیں، جن میں اسلامی قانون یا ملکی آئین کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا، مثلاً ہمارے ملک کے دیہاتوں میں 16 سال سے 40 سال تک کے خواتین و مردوں کو کھلے عام صرف غیرت کے نام پر بے دردی سے قتل کر دیا جاتا ہے، کہیں سے کوئی آواز نہیں اٹھتی، یہ صرف اس لئے کہ کاری قرار دے کر قتل کی جانے والی عورت کسی بڑے باپ کی بیٹی نہیں یا صرف اس لئے کہ ان کا قتل

اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ کسی ہاری کی بیوی یا بہن ہے اور کسی یونیورسٹی کی پڑھی لکھی عورت نہیں بلکہ ایک اجڈ اور گنوار عورت ہے یا پھر کاری کے الزام میں قتل ہونے والی عورت آج بھی پتھر کے دور میں زندہ ہے، جہاں انسانی حقوق صرف بڑے لوگوں کے لئے مخصوص ہیں، جہاں آج بھی ایک نہیں، کئی کئی قتل کے فیصلے علاقے کے وڈیروں کے رحم وکرم پر ہیں اور وڈیرے چاہیں تو فیصلہ کریں اور نہ چاہیں تو نہ کریں۔ ہم دین اسلام کے پیروکار ہیں اور دین اسلام میں ناحق کسی کو اذیت دینا بہت بڑا گناہ ہے تو پھر کاروکاری کے تحت لوگوں کا ہر مہینے بڑی تعداد میں قتل کیا جانا ہمیں کہاں لے جارہا ہے؟ بالائی سندھ کے ستم زدہ دیہاتی مختلف المیوں سے ہمیشہ دوچار رہے ہیں، کیونکہ کبھی انہیں وڈیروں کے ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑتا ہے تو کبھی قبائلی جھگڑے، خاندان کے خاندان اجھاڑ دیتے ہیں یا پھر کسی خاندان کو کاروکاری کے نام پر مشق ستم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔(۱۹)

خلاصہ کلام:.....اسلام ایک جامع دین ہے جو زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں مستقل رہنمائی کرتا ہے، اسلام کے بنیادی مقاصد میں عزت وعصمت کی حفاظت داخل ہے اور اس نے معاشرے کو پاکیزہ بنانے اور پاکیزہ رکھنے کے لئے ایک مرتب نظام دیا ہے، اسلامی ہدایات پر عمل کے نتیجے میں جو معاشرہ تشکیل پائے گا، وہ پاکیزہ معاشرہ ہوگا اور اس میں لاقانونیت کے واقعات نہایت قلیل ہوں گے، اصل اسلامی تعلیم تو یہی ہے کہ کوئی بھی معاملہ ہو عدالت کے حوالے کیا جائے لیکن عملاً صورتحال یہ ہے کہ اسلامی قوانین مدت سے معطل ہیں تو پھر ہر ایک اپنے رسم ورواج کے مطابق ازخود ہی اپنے مقدمات کا فیصلہ کرنے لگے، پھر زمانے کی گرد میں آہستہ آہستہ مقامی رسم ورواج غالب آتے گئے اور اصل اسلامی تعلیم اتنی نایاب ہوگئی کہ اس کو پیش کرنے پر عوام الناس بھی چونک اٹھیں اور جگہ جگہ علماء بھی آج اسی رسم ورواج یعنی پنچائیت اور جرگہ سسٹم وغیرہ کے محافظ بنے بیٹھے ہیں۔(۲۰)

پنچائیت اور جرگہ سسٹم وغیرہ زیادہ تر دیہاتوں سے تعلق رکھتے ہیں تو اس میں کئی وجوہات ہیں، جن میں سے پہلی وجہ جاگیردارانہ اور سرداری نظام ہے، ایک دستور کی حیثیت سے اس کے دوام میں مقامی وڈیروں یا سرداروں (قبائلی سردار یا جاگیردار، عموماً دونوں ہی) کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، زیادہ تر سردار اپنی روایات کے ایک اہم جز کے طور پر اس کی حمایت کرتے ہیں، ان شرفاء میں سے متعدد افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور انہوں نے دنیا دیکھی ہے، ان میں سے کئی اشخاص لوگوں کی نمائندوں کی حیثیت سے ملک کی پارلیمنٹ (جب معطل نہ ہو) میں بیٹھتے اور حکومت میں وزراء اور مشیران کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہیں، وہ سب اس بات سے آگاہ ہیں کہ گزشتہ سو برس میں ان کی جاگیروں سے باہر کی دنیا تبدیل ہوچکی ہے، مگر وہ اس قرون وسطیٰ کی دنیا میں (جس میں وہ خود رہتے ہیں) تبدیلی لانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، کیونکہ اگر وہ ایسی کوئی تبدیلی لائیں گے تو پھر ان کی سرداری یا جاگیردارانہ سوچ اور سسٹم کی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی۔(۲۱)

تعلیم یافتہ افراد یا معاشرہ، سردارانہ اور جاگیردارانہ، مجبور ومقہور سوچ کے تحت پروان چڑھنے کی بجائے اسلامی وملکی قانون کا پابند اور ایک آزاد ومختار سوچ کا حامل ہوتا ہے اور جاگیردارانہ تسلط کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتا، اسی وجہ سے تو یہ بات مشاہدے سے ثابت ہو چکی ہے کہ سردار یا جاگیردار اپنے اور اپنے گھرانے کے لئے ہر قسم کی سہولیات اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے درپے ہوتے ہیں جبکہ اپنے ماتحت رعایا اور قوم کے لئے تمام تر سہولیات سمیت تعلیم کے تمام تر دروازے بند ہوتے ہیں، آج کل اگرچہ جاگیردارانہ نظام اپنے اصل روپ میں قائم نہیں لیکن اس کے اثرات کم وبیش اب بھی کہیں کہیں موجود ہیں، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم اور شعور کا سلسلہ وسیع کیا جائے، خاص کر دیہی علاقوں میں تعلیم عام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

حوالہ جات

(۱).....حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، مکتبہ حقانیہ، ملتان، ج۱، ۴۵-۴۴ (۲).....مفتی محمد تقی عثمانی، اصول الافتاء وآدابہ، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص۸ (۳).....علامہ ابن منظور، لسان العرب، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ج۵، ص۲۰ (۴).....سورہ یوسف ۱۲:۴۳ (۵).....سورہ نساء ۴:۱۲۷ (۶).....سورہ نساء ۴:۱۷۶ (۷).....ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل، سنن دارمی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ج۱، ص۱۷۹ (۸).....مولانا عبدالحقؒ، فتاویٰ حقانیہ، دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک، ۲۰۰۸، ج۱، ص۵۶ (۹).....مفتی محمد تقی عثمانی، اصول الافتاء وآدابہ، ص۱۱-۱۲ (۱۰).....سورہ نساء ۴:۱۷۶ (۱۱).....علامہ ابن قیم، اعلام الموقعین، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ج۱، ص۲۸ (۱۲)..... مولانا عبدالحقؒ، فتاویٰ حقانیہ، ج۱، ص۸۰ (۱۳).....حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، دارالعلوم دیوبند، ج۱، ص۲۵ (۱۴).....ایضاً، ج۱، ص۵۷ (۱۵).....امام ابوداود سلیمان ابن اشعث سجستانی، سنن ابوداود، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ج۲، ص۱۵۹ (۱۶).....ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل، سنن دارمی، ج۱، ص۱۷۹ (۱۷).....علامہ ابن قیم، اعلام الموقعین، ج۲، ص۲۵۶ (۱۸).....حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حیلہ ناجزہ، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص۱۴۹ (۱۹).....روزنامہ جنگ، کراچی، رنگین صفحہ، جون ۲۰۰۵ء (۲۰).....پروفیسر ثریا بتول، جدید تحریک نسواں اور اسلام، منشورات، لاہور ۲۰۰۰ء، ص۴۶۵ (۲۱).....رابعہ علی، غیرت کا تاریک پہلو، مترجم افتخار محمود، شرکت گاہ، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۲۵

☆.....☆.....☆